

اگر طرفۃ العین میں تخت لادینے والا انسان ہو سکتا ہے تو گھڑی بھر میں لانے والا انسان کیوں نہیں ہو سکتا۔

ان توجیہات کی روشنی میں کیا آپ اس پر مزید غور فرمائیں گے؟ اتنا اور بھی گزارش کر دوں کہ اگرچہ صاحب تعلیمات نے اپنے جواب میں شیطان اور ابلیس کے فرق کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ ابلیس یقیناً جن ہے لیکن چونکہ ہر شیطان ابلیس نہیں، اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں۔ شیاطین کا لفظ قرآن کریم میں انسانوں کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔ لیکن آپ اپنی تنقید مزید میں و الشیاطین کل بناء و غواص، کے ترجمہ میں شیاطین (یا جن) لکھ کر مفہوم پھر جنوں کے متعلق لے گئے ہیں۔ اگر ان شیاطین کو ہم انسان ہی مان لیں تو ان کے مرنے ہونے کی وجہ سے کیا یہ خیال قرآن کریم سے زیادہ قریب نہیں ہوگا؟ (باقی)

الجواب

حقیقت جن | جن کی حقیقت کے متعلق شبہات کی ابتدا دور جدید میں غالباً انیسویں صدی کے وسط آخر میں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں محض کسی مذہبی کتاب کی سند پر کسی ایسی شے کو موجود ماننا جس کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ ہو بڑے شرم کی بات ہو گئی تھی اور ایسی شرمناک بات کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اس زمانہ کے اہل علم کی نگاہوں میں تاریک خیال اور توہم پرست کٹھ ملا بننے کے لئے تیار ہوتا۔ ان حالات میں ان مسلمانوں نے جو اپنی دنیوی ترقی کے لئے اپنے غیر مسلم آقاؤں اور پیشواؤں کی نگاہوں میں روشن خیال اور عقل پرست بننا ضروری سمجھتے تھے ایک نئی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا اور ہر اس مسئلہ کو جسے ماننے کے لئے

انیسویں صدی کے مادہ پرست بندگان جو اس وپرستارانِ عادتِ آمادہ نہ ہو سکتے تھے ایسے عجیب طریقوں سے تاویل کے خزاں پر چڑھایا کہ وہ مسئلہ قرآن سے خارج بھی نہ ہوا اور ان لوگوں کے افکار و تخیلات کے مطابق دھصل بھی گیا جو قرآن کی روح اور اس کے اصولِ اولیہ سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں جن قرآنی ارشادات کو توڑا مروڑا گیا انہی میں سے ایک وہ ارشادات ہیں جو ابلیس، شیاطین اور جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا کہ ان الفاظ سے کوئی ایسی مخلوق مراد نہیں ہے جو انسان سے الگ کوئی فوقِ طبعی وجود رکھتی ہو، بلکہ ان سے کہیں تو انسان کی اپنی ہی قوتیں مراد ہیں جنہیں شیاطین کہا گیا ہے اور کہیں ان سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں اور کہیں ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن مجید سناتے تھے یہ تاویلات اتنی کرلیک ہیں کہ ان کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو عربی زبان اور قرآن مجید کا تھوڑا سا علم بھی نہ رکھتا ہو یا پھر اس کے دل میں خدا اور یومِ آخر کے خوف سے زیادہ دنیا اور اہل دنیا کا خوف ہو لیکن ۱۹۵۰ء کے ہنگامے کے بعد جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان گزرے ہیں ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی تھیں اس لئے ایسی اور اس سے بھی زیادہ رکیک تاویلات قرآن مجید میں کی گئیں اور طر فہ ماجرایہ ہے کہ ادعائے علم و حمایتِ اسلام کے ساتھ کی گئیں!

جس طرح انسان پر بہت سے دور گزر چکے ہیں اسی طرح یہ دور بھی گزر گیا۔ اب خود یورپ میں بھی ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو روحانیت کا قائل ہے اور اس محسوس و مرئی دنیا کے علاوہ ایک ایسے عالم کے وجود کو بھی مانتا ہے جو ہمارے اس سے پوشیدہ ہے۔ اس لیے اب جن اور شیاطین کے متعلق وجود کو تسلیم کرنا اتنا خطرناک نہیں رہا ہے جتنا اب سے بیس پچیس برس پہلے تھا۔ تاہم ابھی اس دور کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں اور ابھی تک محض قرآن کی سند پر کسی ایسی بات کو ماننے سے دماغ انکار کر رہے ہیں جو فوقِ طبعی ہونے کے ساتھ خارقِ عادات

بھی ہو۔ یہ اسی دور کے بچے کچھے اثرات تھے جو تعلیمات قرآن میں ہم کو نظر آئے۔ مولانا اسلم جیراج پوری قرآن کے صریح ارشادات کو دیکھ کر یہ تو ماننے پر مجبور ہو گئے کہ ”جن“ سے مراد ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان سے علحدہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن قرآن میں جگہ جگہ جنوں کی طرف جو امور منسوب کیے گئے ہیں، وہ چونکہ خارق عادت ہیں، اور ان کو بعینہ اس طرح ماننا جس طرح قرآن میں وہ بیان ہوئے ہیں، اقتضائے عقلیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کسی نہ کسی طرح تاویل کر کے جنوں کی دو قسمیں قرار دے لیں۔ ایک وہ مخصوص نوع کی مخلوق جو ناری الوجود ہے اور انسان سے اصلاً مختلف ہے۔ دوسرے انسانوں کا کوئی خاص طبقہ جس کے متعلق وہ خود جانتے ہیں نہ کسی حوالہ سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا طبقہ ہے اور کس بنا پر ”جن“ کے نام سے موسوم ہو گیا؟

ہمارے دوست چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، الحمد للہ ان اثرات سے محفوظ ہیں مگر پھر بھی ایک مقام پر ان کو ”جن“ کے انسان ہونے کا شبہ ہو ہی گیا۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کے اس خیال سے تو متفق نہیں ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد آتشیں جن نہیں بلکہ انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے، لیکن خاص کر حضرت سلیمان کے جنوں پر ان کو بھی شبہ ہے کہ وہ انسان ہی تھے، آتشیں نہ تھے، کیوں کہ نظر آتے تھے اور انسانوں کی طرح غوطے لگاتے اور برتن بناتے تھے۔

ایک قاعدہ | اس مسئلہ کی تحقیق میں آگے قدم بڑھانے سے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کر لیجئے اللہ تعالیٰ جب اپنی معلومات میں سے کسی ایسی شے کو جو ہمارے دائرہ علم و ادراک سے خارج ہے، ہمارے علم میں لانا چاہتا ہے، تو لا محالہ وہ اس شے کو ہماری زبان کے کسی ایسے ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کو ہم نے اس معلوم الہی کے ساتھ قریب تر مناسبت رکھنے والی کسی چیز کے لئے وضع

کیا متعنا تا کہ ہم اُس شے کا کسی حد تک صحیح تصور کر سکیں جو اللہ کے علم میں ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کسی چیز کو یونہی کسی مناسبت اور ربط معنوی کے بغیر خاص لفظ سے موسوم کر دے درالحکام اس چیز کے لیے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر اُس خاص لفظ کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جس چیز کو جنت سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے لفظ "جنت" بمقابلہ "جہنم" کے اولیٰ نہ ہوتا اور جس چیز کو "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے اُس کے لیے "نار" کا استعمال بھی اسی طرح جائز ہوتا۔

جَن کی لغوی تحقیق

اس قاعدہ کے مطابق ہم کو سب سے پہلے لفظ "جن" کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کلام عرب میں اس کو کس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا اور حق تعالیٰ نے جو اس کو اپنی ایک خاص مخلوق کے لیے دوسرے الفاظ کے مقابلہ میں ترجیح دی تو کس مناسبت کی بنا پر دی۔

"جن" کا مادہ ج ن ن ہے۔ اس مادہ کا مرکزی تصور پوشیدگی ہے اور اس کے تمام مشتقات میں کسی زبسی طور پر یہ تصور ضرور پایا جاتا ہے اصل الجن ستر المشی من الحاسہ۔ (مرغب اكل شیء ستر عنك فقد جن عنك) (جمہرہ ابن درید و لسان العرب)۔

اسی بنا پر جنان ہر چیز کے جو ف کو کہتے ہیں جو نظر نہیں آتا روح کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ جسم کو چھپا ہو ہو۔ دل کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صندوق سینہ میں مستور ہے۔ حریم خانہ کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چہار دیواری سے چھپا ہوا ہے۔ باغ کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ درختوں کے جھنڈ اس کی زمین کو چھپا لیتے ہیں۔ اگر باغ میں یہ صفت نہ ہو تو اس کو جنت نہیں کہہ سکتے۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے جنین ہے۔ جسم کو بھی جنین کہتے ہیں۔ میت جب دفن کر دی جائے تو وہ بھی جنین ہے۔ حتیٰ کہ ہر چیز جو چھپی ہوئی ہے اس پر جنین کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ چھپے ہوئے کینے کو حقد جنین کہا گیا ہے۔ قبر کو جن کہتے ہیں۔ کفن کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ دفن کرنے کے لیے اِجنان کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

ولی دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم وإجنانہ علی والعباس۔ پر دے اور آؤ کو جنت کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے اتخذوا ایماہم جنتاً انہوں نے اپنی قسموں کو اس نفاق کے لیے پر وہ بنالیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں۔ جنت و جن علیہ چھپا لیا اس کو۔ چنانچہ قرآن میں ہے فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْنَا اللَّيْلُ جَبَّ رَاتِ كِي تَارِكِي اس پر چھا گئی۔

إجنان کے معنی چھپا دینا اور استجنان کے معنی چھپ جانا۔ جنّ اللیل و جنان اللیل و جنون اللیل رات کی شدید تاریکی جو پر وہ پوش ہوتی ہے۔ چنانچہ زورید بن الصمہ کہتا ہے وَلَوْ لَا جَنُونَ اللَّيْلِ أَدْرَكَ رُكْعُنَا

اور ہڈی کہتا ہے۔

حتى يضيء و جن اللیل یوعده

راز اور پوشیدگی کو بھی جن کہتے ہیں۔ مثل ہے لاجن بھٹن الا صر۔ یعنی اس معاملہ میں کوئی راز نہیں ہے۔ جنّ الناس اور جنات الناس آدمیوں کی اُس بھڑ کو کہتے ہیں جس میں اگر کوئی آدمی گھر جائے تو پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کے نام سے جس نوع مخلوقات کو موسوم کیا جائیگا وہ لازمی طور پر غیر محسوس یا کم از کم مستور ہونی چاہیے۔ جس مخلوق میں مستوری کی صفت نہ پائی جائے اُس کو اس نام سے کبھی موسوم نہ کیا جائیگا۔ تمام اکابر اہل لغت نے بالاتفاق یہی بات جنوں کی وجہ تسمیہ میں لکھی ہے۔ چنانچہ جہرہ ابن درید مفردات امام راجب اصحاب قاموس لسان العرب، تاج العود، غرض عربی زبان کی کسی مستند کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سب میں یہی لکھا ملیگا کہ ”جن“ اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

کلام عرب کی شہادت | لغت کے بعد کلام عرب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے

بطور خود یہ کوئی نئی اصطلاح وضع نہیں کی تھی۔ بلکہ اہل عرب پہلے سے ایک ایسی فوق طبیعی مخلوق کو جن کے نام سے یاد کرتے تھے جو بالاصل غیر مرئی و غیر محسوس تھی، مگر کبھی کبھی ان مختلف شکلوں میں نظر آتی تھی اور جس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ غیر معمولی افعال پر قادر ہے اور عالم طبیعت و اجسام پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خاص خاص مقامات پر یہ مخلوق قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات کو وہ ارضی مجسمہ کہا کرتے تھے خانی مکانوں کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں جنوں کا تسلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص کسی خالی مکان میں رات گزارتا تو اس کو کہتے کہ وہ رات جنوں کا جہان تھا۔ خطل کہتا ہے :-

وبتنا کانا ضیف جن بلیلة

جہلائے عرب جب کوئی نیا مکان بنواتے تو پہلے وہاں جنوں کے لئے قربانی کرتے تاکہ وہ ساکنین مکان کو نہ ستائیں۔ اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ اِنَّهُ غَلِيٌّ عَنْ ذَبَائِحِ الْجَنِّ یعنی آپ نے جنوں کے لئے قربانی کرنے کی مانعت کر دی۔ جب کوئی انسان پاگل ہو جاتا تو یہ لوگ سمجھتے کہ اس پر جن مسلط ہو گیا ہے۔ اسی لیے اس کو مجنون کہتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی ان کے اس خیال کو بیان کیا گیا ہے کہ اختری عَنِ اللّٰهِ كَذِبًا اَمْرًا حَقًّا (۱:۳۳) جب گائے پانی پیتی تو اس کے زکوارا جاتا تھا۔ کیونکہ اعتقاد یہ تھا کہ جن اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ مادہ کو پانی پینے سے روکتا ہے۔ ان کا وہم تھا کہ ایک جن ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو وہ ”تابع“ یعنی ہمزاد کہا کرتے تھے۔ ہر غیر معمولی چیز جنوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کام میں بہت تیز ہوتا اس کے متعلق وہ سمجھتے کہ جن اس میں سما جاتا ہے۔ اس لئے اس کو جتنی (یعنی منسوب بہ جن نہ کہ خود جن) کہا جاتا تھا۔ ہر شاعر کا ایک خاص ”جن“ ہوتا تھا اور وہی اس کو شعر کہوایا کرتا تھا۔ جب کسی شخص کا زور ٹوٹ جاتا تو کہتے کہ نفرت جنہ

ابن ورید کہتا ہے :- ”وَالْجَنُّ خِلَافُ الْإِنْسِ“۔

چند مقدمات یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں :-

ایک یہ کہ لغت عرب میں لفظ جن کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں ”جھپے ہوئے“ اور ”پوشیدہ“ کے ہیں۔ اس لفظ کو جب انواع مخلوقات میں سے کسی نوع کے لیے بطور اسم استعمال کیا جائیگا تو فرض ہے کہ وہ کوئی ایسی نوع ہو جو عادتاً مخفی و مستور ہو حتیٰ کہ اس کا ظاہر اور نمایاں ہونا خرق عادت میں سے شمار کیا جائے نہ یہ کہ وہ عادتاً ظاہر اور نمایاں ہو جیسے انسان۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ لفظ سیال کا اطلاق ہمیشہ ایسی ہی چیز پر کیا جائیگا جو عادتاً بہنے والی ہو اور اگر کبھی وہ جامد پائی جائے تو اس کا جمود خلاف معمول شمار کیا جائے (مثلاً پانی)۔ لیکن اگر کوئی شخص لفظ سیال کا اطلاق کسی ایسی چیز پر کرے جو عادتاً جامد ہو (مثلاً پتھر) اور جس کا جامد ہونا نہیں بلکہ سیال ہونا خلاف معمول ہو تو آپ یقیناً حکم لگا دیں گے کہ وہ شخص لفظ سیال کے معنی سے ناواقف ہے اور لفظ کو اس کے غیر معنی موضوع لہ میں استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید میں لفظ ”جن“ (مخفی و مستور) کا اطلاق کسی ایسی مخلوق پر کیا جاتا جو عادتاً مخفی و مستور نہیں ہے بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرئی اور محسوس ہے (مثلاً انسان) تو لغو و بامشایہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ اس کتاب کو پیش کرنے والا یا توحجنون ہے یا لفظ ”جن“ کے معنی سے ناواقف ہے۔ یقیناً مانے کہ ایسی صورت میں خواہ تمام عجم قرآن پر ایمان لے آتا، مگر کوئی عرب تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتا، کیوں کہ وہ ”جن“ کا بطور معجزہ و خرق عادت مرئی و محسوس بن جانا تو مان سکتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ مرئی و محسوس انسان کو ”جن“ کے لفظ سے تعبیر کیا جائے جس وقت کفار عرب نے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی عجیب شخص قرآن سکھاتا ہے تو اپنے اس دعویٰ کی تائید میں وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے اور جب قرآن نے ان کے اس الزام کا یہ جواب دیا کہ لِسَانَ الَّذِي يُخَادِعُونَ الْإِنْسَانَ

اعجمی و هذا لسان عربی تبیین (۱۶ : ۱۷)

جس شخص کو یہ سکھانے والا بناتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے حالانکہ قرآن جس زبان میں ہے وہ عربی سہین ہے۔ تو اس جواب کو سن کر تمام عرب کی زبانیں بند ہو گئی تھیں لیکن اگر کہیں اس وقت کفار عرب کو قرآن میں ایک مثال بھی ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ "جن" کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہوتا تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان عربی سہین ہے جس میں "جن" کا اطلاق انسان پر کیا جا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ عرب میں پہلے سے "جن" کا نام ایک ایسی فوق طبیعی غیر جسمانی مخلوق کے لیے موضوع اور شائع و متعارف تھا جو عاداتاً محسوس نہ ہوتی تھی جس کو کبھی کبھی وہ "سعالی" اور غول وغیرہ کی شکل میں دیکھتے تھے اور جس کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ فوق طبیعی انداز سے ان پر اثر انداز ہوتی ہے پس جب قرآن نے اس شائع شدہ لفظ کو استعمال کیا تو لامحالہ اس کے معنی وہی لیے جائینگے جن کے لیے وہ پہلے سے وضع کیا ہوا تھا اور شائع تھا۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ عربی میں اتارا گیا ہے تاکہ عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں اس کو سمجھ سکیں "إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۱۱:۱۲)" یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ہو سکتا تھا کہ قرآن میں وہی الفاظ اور اصطلاحات اور انداز بیان استعمال کیے جائے جو عرب میں رائج اور معروف تھے اور اگر اہل عرب کی زبان کے کسی لفظ کو معلوم و متعارف معنی کے سو کسی خاص معنی میں استعمال کیا جاتا تو وہ اصل لغت کے خلاف نہ ہوتا اور اس خاص معنی کی تشریح کر دی جاتی کہ عرب اس کو سمجھ سکتے لیکن آپ لفظ "جن" کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ نہ تو اصل لغت کے مطابق ہیں نہ کلام عرب میں معلوم و متعارف ہیں اور نہ ان کی کوئی ایسی تشریح قرآن میں ملتی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس نام کا وہ شئی مراد نہیں ہے جو اہل عرب نزول قرآن کے وقت اس سے مراد لیتے تھے کیا یہ بات قرآن کے اس دعویٰ کی تکذیب کو متضمن نہیں ہے؟

تیسرے قرآن میں جگہ جگہ عربوں کے اس اعتقاد باطل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جن اور ملائکہ کو خدائی میں شریک کرتے خدا سے ان کا نسب جوڑتے ان سے پناہ مانگتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ پھر اس اعتقاد کا ابطال اس طرح کیا گیا ہے کہ جن خدا کے شریک نہیں ہیں نہ اس کی اولاد ہیں بلکہ وہ بھی اسی طرح کی ایک مخلوق ہیں جس طرح انسان اس کی مخلوق ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا ہے اور جن آگ کی پھونک سے۔ مگر احکام خداوندی کے مخاطب دونوں ہیں خدا کے سامنے جواب دہ ہونے میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور نافرمانی کی سزا دونوں کے لیے یکساں ہے۔ پس انسان کا ان کی عبادت کرنا محض ایک جاہلانہ فعل ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے لیے ذلت بھی ہے اس لیے کہ انسان ایک بالاتر نوع ہے۔ جنوں کے نمائندے ابلیس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور انکار کرنے پر راندہ درگاہ کیا گیا انسان کو رسالت کے بلند منصب پر سرفراز کیا گیا اور جنوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت دی گئی۔

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ ۖ لَّا يَلِيهِ (۴۶: ۴۶) قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ (۴۷: ۴۷) انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ ہستی (سلیمان علیہ السلام) کو یہ شرف عطا ہوا کہ جن اس کے تابع کیے گئے۔ یہ تمام باتیں عربوں کے ان اعتقادات باطلہ کی تردید اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جبکہ ان میں جن سے مراد وہی مخلوق ہو جس کو وہ خدائی میں شریک اور عبادت میں خدا کا سا جھبی بناتے تھے۔ لیکن اگر ان میں جن سے مراد انسان ہوں تو پھر کسی طرح بھی ان اوہام کا ابطال کرنے والی نہ ہوگی اور عربوں کے وہ اعتقادات اپنی جگہ پر رہیں گے جو وہ اپنے متصور جنوں کے متعلق رکھتے تھے۔

چوتھے اگر جنوں کے ذکر سے کسی خاص مقام یا بعض مخصوص مقامات پر قرآن کا مقصود واصل انسانوں یا ان کے کسی خاص گروہ کا ذکر کرتا تھا تو ان کو لفظ "جن" سے تعبیر کرنے کے لیے کوئی ضرورت داعی ہوئی ہوتی؟ کیوں نہ ان کو لفظ انسان ہی سے تعبیر کیا گیا؟ خواہ مخواہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا حاجت پیش آئی تھی جن سے ناری جن اور خاکی جن کے درمیان التباس واقع ہوتا؟ یہ وہ

بات ہے جس کو ہمارے زمانے کے اکثر اہل تاویل قرآنی الفاظ کے معنی بیان کرتے وقت نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ اس پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے کہ جب کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لیے معروف اور شائع الفاظ موجود ہیں اور خود قرآن نے بھی اس معنی کو بیان کرنے کے لیے حسب موقع وہی الفاظ استعمال کیے ہیں تو آخر کیا وجہ ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر اسی معنی کو بیان کرنے کے لیے (اگر واقع میں اس کا مقصود وہاں وہی معنی بیان کرنا ہو) بعض دوسرے الفاظ استعمال کرتا دراصل حالیکہ وہ الفاظ اس معنی کے لیے شائع اور متعارف نہ تھے اور نہ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر واقعہ یہ تھا کہ حضرت سلیمان کو مصر سے یا دوسرے مقامات سے اعلیٰ درجہ کے غواص، ظروف، ساز، معمار اور سنگ تراش آدمی فراہم کر کے دیے گئے تھے تو یہی کہہ دینے میں کونسا امر مانع تھا کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایسے اور ایسے آدمی فراہم کر دیے تھے۔ کیا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا کہ مجبوراً اس کو ”جن“ اور ”شیاطین“ کے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا خود اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کا ذکر کرنے کے مواقع پر ان کو انسان یا بنی آدم کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا ہے؟ اور اگر ان خاص آدمیوں میں کوئی خصوصیت ایسی تھی کہ اس کو ”جن“ اور ”شیاطین“ کے استعاروں میں ادا کرنا ضروری تھا تب بھی اس تصریح میں کیا چیز مانع تھی کہ ”یہ جن“ بنی آدم سے تھے؟

قرآن میں منی جن کی تصریح ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن مجید نے لفظ ”جن“ کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں ”جن“ اور ”انسان“ کی حقیقتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں اور بالفاظ صریح ایک جگہ نہیں متعدد جگہ بتایا گیا ہے کہ ”جن“ ایک ناری الاصل مخلوق ہے اور ”انسان“ ارضی الاصل ہے۔ لفظ ”جن“ کو استعمال کرنے کے ساتھ جب اس کے معنی کی یہ تصریح بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہے تو عقل یہ چاہتی ہے کہ جہاں کہیں وہ لفظ استعمال ہو وہاں اس کے وہی معنی لیے جائیں جن کی تصریح

کی جا چکی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اور معنی لینے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس دوسرے معنی کی بھی کوئی ویسی ہی تصریح قرآن میں موجود ہو یا پھر آپ کے پاس ایسے قوی دلائل ہوں جن کی بناء پر قرآن کی تصریح کے خلاف معنی میں اس لفظ کو لینا جائز ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم کوئی ایک ہی آیت ایسی پیش فرمائیے جس میں ”جن“ بمعنی ”انسان“ کی جگہ ”جن“ بمعنی ”مخلوق“ پیش کی تصریح ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کو حق ہے کہ آپ کے دلائل کا جائزہ لیکر دیکھیں کہ آیا وہ اس حد تک قوی ہیں کہ قرآن نے ”جن“ کے جس معنی کی تصریح کی ہے اس کو چھوڑ کر آپ کے تجویز کردہ معنی کو قبول کیا جائے؟

جن بمعنی انسان کی پہلی مولانا اسلم حیراج پوری نے جس بناء پر ”جن“ کے انسان ہونے کا گمان کیا دلیل ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

”جن کا لفظ قرآن میں صرف کئی سورتوں میں آیا ہے۔ مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا۔ اور اس کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتش جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔“

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ کسی سورت کے کئی یا مدنی ہونے اور جن کے ساتھ انس کا لفظ آنے یا نہ آنے کو لفظ ”جن“ کے معنی میں آخر کس قسم کا دخل حاصل ہے؟ آپ ان تمام آیتوں کو

اے بشارت قرآن میں دو جگہ ”جان“ کا لفظ ”سانپ“ کے معنی میں آیا ہے، لیکن اول تو خود قرآن ہی میں دوسری جگہ اس چیز کی تعبیر اور حقیقت کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ وہاں جان کا لفظ کس معنی میں آیا ہے دوسرے لفظ جان بمعنی ”مخلوق“

نکال کر دیکھ لیجئے جن میں "جن" اور "انس" کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں کسی جگہ بھی آپ کوئی اشارہ ایسا نہ پائیں گے جو انس کے عام اور جن کے خاص ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں کہیں جن اور انس کے الفاظ معطوف و معطوف علیہ کی حیثیت سے آئے ہیں وہاں حرف عطف نہ تو عطف العام علی الخاص یا عطف الخاص علی العام کے طور پر آیا ہے اور نہ عطف اشئی علی مرادفہ کے طور پر۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کے عطف کا حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ سامع کو پہلے سے اس کا علم ہو کہ معطوف و معطوف علیہ میں سے ایک عام ہے اور دوسرا خاص یا دونوں مرادف ہیں۔ مثلاً اَبْتَغِفْ لِيْ وَلَدًا وَلَمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا وَالْمُؤْمِنَاتِ فِيْ سَاعِ خَوْذِ سَمْعٍ خود سمجھ سکتا ہے کہ عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔ یا اِذَا اخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّنَ مِيثَاقَهُمْ فَعَسَا مِنْ تَوْحِجٍ۔ میں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ یا اِنَا لَفِيْ قَوْلٍ كَذَبًا وَمُثْنًا میں عطف کا عطف اشئی علی مرادفہ کے قبیل سے ہونا ہر وہ شخص جانتا ہے جو "کذب" اور "میں" کے معنی سے واقف ہے۔ پس جب جن و انس میں یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان دونوں کے درمیان واو عطف مطلق معیت کے لیے ہے۔ کیونکہ لغت سے یا عرف سے یا کسی قرینہ عقلی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص یا ترادف کا تعلق ہے اگر قرآن کی اصطلاح خاص ہیں ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص کا تعلق ہوتا اور پھر بغیر کسی تصریح کے وہ ان دونوں کے درمیان محض واو عطف استعمال کرتا تو یہ اس کے بیان کا نقص ہوتا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کم از کم الانس والجن منہم ہی کہنا چاہیے تھا کہ سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ جن کے نام سے جس گروہ کو یاد کیا جا رہا ہے وہ لغت اور عرف عام کے خلاف، انسانوں ہی کا ایک گروہ ہے۔ لیکن ہم کو عطف و معطوف کی بحث میں بھی بٹرنے کی ضرورت نہیں۔ مدعی کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں انس اور جن کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں

ہی کا ایک طبقہ ہے۔ اب آپ ان تمام آیات کو پڑھ جائیے جن میں یہ دونوں لفظ یک جا استعمال ہوئے ہیں اگر خود انہی میں متعدد آیتیں آپ کو ایسی مل جائیں جن میں ان دونوں گروہوں کی منہایت صاف نظر آتی ہو تو دعویٰ کا دعویٰ آپ باطل ہو جائیگا۔

ہم نے انسان کو کالے شرے ہوئے گار سے پیدا کیا اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم نے ٹوکی گرمی سے پیدا کیا تھا۔

اس نے انسان کو پٹری کی طرح کی بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لہر سے۔ اس روز اس کے گناہ کی بابت نہ کسی انسان سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی جن سے۔ ان سے پہلے اُن حوروں کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔

انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے۔

جس روز اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع کرے گا پھر ملائکہ سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہیں کو پوجا کرتے تھے؟ وہ عرض کریں گے تو پاک ہے ہمارا ولی تو ہے نہ کہ یہ۔ دراصل یہ لوگ سہادی نہیں بلکہ جنوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمِإٍ مَسْنُونٍ وَالْإِنْسَانَ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السُّمُورِ (۳: ۱۵)

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَّارٍ (۱۱: ۵۵) فَيَوْمَئِذٍ لَا يَسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ (۲: ۵۵)

لَقَدْ يَطْبَئُهُنَّ أَنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (۳: ۵۵)

كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ (۱۰: ۲)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهْؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ۔ وَتَالُوَا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيِّنَا مِنْ دُونِهِمْ۔ بَلْ كَانُوا

ان میں سے اکثر درحقیقت انہی پر ایمان رکھتے تھے۔

اور انہوں نے خدا کے اور جنوں کے درمیان شریک جوڑ رکھا تھا۔

اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا تو فرمائے گا اے گروہ جن تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ اور انسانوں میں سے جو ان کے دوست ہیں وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم میں سے بعض نے بعض سے خوب فائدہ اٹھایا اور اب ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔

يَعْبُدُونَ إِلَٰهًا مَّا كَثُرَ هُمْ
بِهِمْ مُؤْمِنُونَ - (۵: ۳۳)

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ
نَسَبًا (۵: ۳۴)

وَيَوْمَ يُنْفَخُ هُمُ جَمِيعًا
مَعَشَرَ الْجَنَّةِ قَدْ اسْتَكَثَرْتَ ثَمَرِ
الْأَلْسِ وَقَالَ أَوْلِيَّتُهُمْ مِنَ الْإِنْسِ
رَبَّنَا اسْمِمْ لَنَا بِعَظْمٍ
وَبَلَعْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَلْت
لَنَا (۵: ۶)

ان آیات سے کیا ثابت ہو رہا ہے؟ یہ کہ جن اور انس دو الگ اور متباہن الحقیقت گروہ ہیں؟ یا یہ کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ایک جز ہے؟

دوسری دلیل [دوسری دلیل جس میں آپ اور مولانا اسلم جیراج پوری متفق ہیں] یہ ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت کو جو جب تصریح قرآن جن ہیں اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی بیان کیا ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَتَبٰیئُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْهُمْ (۳: ۷۸) بخلاف اس کے حضرت سلیمان کے پاس جو جن تھے وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے۔ لہذا حضرت سلیمان والے جن وہ آتشیں جن نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں۔

اس کے جواب میں بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت سلیمان والے جنوں کے متعلق

قرآن میں کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ وہ نظر آتے تھے، انسانی شکل میں تھے، اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ عام لوگ بھی ان کو دیکھتے تھے لہذا قرآن کی جو آیت آپؐ پیش فرما رہے ہیں وہ ان آیات کے خلاف نہیں ہے جن میں حضرت سلیمانؑ والے جنوں کا ذکر آیا ہے۔ رہا آپ کا یہ گمان کہ وہ انسانوں کے سے کام کرتے تھے، تو یہ بھی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح پانی میں غوطے لگاتے تھے، یا انسانوں کی طرح برتن اور عمارتیں بناتے تھے، یا انسانوں کی طرح باندھے جاتے تھے۔ وہاں تو مطلقاً غواصی اور ظروف سازی اور معماری وغیرہ کا ذکر ہے اور محض اس ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غواصی وغیرہ انسانوں کی سی غواصی وغیرہ تھی، تا وقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غواصی بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ہے جس طریقہ سے انسان غوطہ لگاتا ہے اور ظروف سازی وغیرہ امور انہی طریقوں میں منحصر ہیں جنہیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ اگر محض یہ بات کہ جو فعل انسان کرتا ہے وہ کسی ہستی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ حکم لگانے کے لیے کافی ہو کہ وہ ہستی لاحالہ انسان ہی ہونی چاہیے، تو ایک شخص نعوذ باللہ خود امتداد تعالیٰ کو انسان کہہ سکتا ہے، کیوں کہ قرآن میں بعض وہ افعال جو انسان کرتے ہیں، خدا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ مثلاً بولنا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس پہلو سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آتے تھے، اور انسانوں ہی کی طرح وہ سب افعال کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، تب بھی جو آیت آپؐ پیش فرما رہے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس گروہ مخلوقات سے خارج تھے جو نظر نہیں آتا اس لیے کہ کسی مخلوق کا ایسا ہونا کہ وہ انسان کو نظر نہ آئے، اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا نظر آنا ممکن ہی نہ ہو، اور بطور خرق عادت بھی وہ نظر نہ آ سکے۔ قرآن مجید میں شیاطین جن کے غیر مرئی ہونے کی صفت تو صرف ایک ہی جگہ بیان ہوئی ہے۔ مگر ملائکہ

کی اس صفت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ مثلاً

إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ (۶:۸)

یعنی شیطان نے اپنے اولیاء سے کہا کہ میں فرشتوں کی وہ خوبیاں دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔

فَأَنزَلَ اللَّهُ سُكْرِيْنَتَهُ عَلَيْهِ وَآيَاتِهِ

يُجْنُوْنَ لَمْ تَرَوْهَا (۶:۹)

پھر اللہ نے اپنی سکینت اُس پر اتاری اور ایسے شکروں سے اُس کی تائید کی جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔ اور وہ لشکر اتارے جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔

وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (۴:۹)

إِذْ جَاءَ ثَكْرُ جُنُودٍ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

رِيْحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (۲:۳۳)

جب تم پر فوجیں حملہ آور ہوئیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہ آتے تھے جس روز یہ لوگ ملائکہ کو دیکھینگے اس روز مجرموں کی خیر نہ ہوگی۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ

لِلْمُجْرِمِيْنَ (۳:۲۵)

اس کے باوجود متعدد مواقع پر قرآن مجید ہی نے بیان کیا ہے کہ ملائکہ انسانی شکل میں آتے ہیں نہ صرف انبیاء بلکہ عام انسانوں تک۔ ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں بوالہ یہ ہے کہ ان بہت سی مستثنیٰ مثالوں کو دیکھ کر آپ نے ملائکہ کے متعلق بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ ان سے مراد بھی انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے، غیر مرئی ہونے میں دونوں برابر۔ انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے واقعات ملائکہ میں متعدد اور جنوں میں صرف ایک باوجود اس کے تعجب ہے کہ آپ ملائکہ کے متعلق تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ و خرق عادت بار بار وہ انسانی صورت اختیار کرتے رہے ہیں۔ لیکن جنوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ سن کر آپ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ حضرت سلیمانؑ کی غیر معمولی دعا کو قبول کر کے جس طرح اللہ تعالیٰ نے

خرف عادت کے طور پر ہوا اور پرندوں کو اُن کے تلمیج کیا تھا اور اُن کو جانوروں کی بولیاں سکھائی تھیں اُسی طرح بطور خرف عادت اس نے جنوں کو بھی مرئی اور محسوس بنا دیا ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ قرآن کی تمام تصریحات اور لغت عرب کے خلاف یہ تاویل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ صرف اس خاص موقع پر انسانوں کو جن کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مولانا نے جیراج پوری تو اس ایک مثال سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کی ایک مستقل قسم کا نام ہی جن فرض کر لیتے ہیں وراں حالیکہ اس کے لیے کوئی قوی ثبوت اُن کو قرآن سے نہیں ملا اور اس کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیات اور کلام عرب کی واضح شہادتیں موجود ہیں اتنی بڑی ذمہ داری کا بار اٹھانے سے پہلے کیا اس بات پر غور کر لینا بہتر نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غیر مرئی مخلوق کو مرئی بنا دینا کونسا ایسا مستبعد اور محال امر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی مشقت اور اتنے تکلف کی حاجت پیش آے؟ جب آپ نے لمانکہ جیسی لطیف مخلوق کا مرئی ہو جانا مان لیا تو شیطاں جیسی کثیف مخلوق کے مرئی ہو جانے میں آپ کو اتنا استبعاد کیوں محسوس ہوتا ہے؟ قرآن مجید میں جنوں کی جو کچھ حقیقت بیان کی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک آتشیں مخلوق ہیں لیکن جبریل فرشتے کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وہ ”روح“ اور وہ بھی روح اللہ ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے اچھے خاصے آدمی کی شکل میں ارہوئی یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو لیکر روح الامین اترتا ہے۔

فَارْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَمَثَلْ لَهَا
بَشَرًا سَوِيًّا (۲:۱۹)۔
وَإِنَّهُ لَنَزَّلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزْلًا
بِهِ الرُّوحُ الْآمِينَ (۱۱:۲۶)۔

جب ”روح اللہ“ جیسی مجرد از عوارض مادہ شے کا بذل الہی مرئی ہو جانا ممکن ہے تو ”نار السموم“ جیسی چیز کا جو مادے اور مادہ کی تکاثف سے قریب تر

ہے، جسمیت اختیار کر لینا کیوں ناممکن یا بعید از عقل و قیاس ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر قرآن میں تاویلات بعیدہ کا دروازہ کھولا جائے۔ قرآن کی رو سے تو صرف باری تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ انسان کی نگاہیں اس دنیا میں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، لَآ تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ هُوَ يُدْرِكُ الْبَصَارَ (۱۳: ۶) اور قَالَ رَبِّ ارْنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِيْ (۱۴: ۷) یہ صفت بالذات صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ صفت بالذات نہیں ہے۔ البتہ بعض کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ عادتاً وہ نظر نہیں آتیں لیکن اگر خدا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے کہ خواہ اُن کو مرئی کر دے یا ہماری نظروں کو اتنا تیز کر دے کہ ان کی لطیف تر صورتوں کو دیکھ سکیں۔

تیسری دلیل | آپ نے اور مولانا اسلم جیراج پوری نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو غوطہ خور اور معمار وغیرہ تھے ان کو شیاطینؑ کہا گیا ہے۔

۱۔ جنوں کی تخلیق جس آگ سے ہوئی ہے وہ میرے نزدیک وہ آگ نہیں ہے جو کیمیاوی استحالات سے مادی اجسام میں پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ ایک خاص طور کی آگ ہے ہماری ان مادی آگوں سے مختلف چونکہ انسانی زبان میں اس کو تعبیر کرنے کے لیے ”نار“ سے زیادہ اقرب کوئی لفظ نہ تھا اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو اس لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نَفْسُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سے مراد وہ شعاع نہیں ہے جو مادی نیرات سے نکلتی ہے بلکہ ایک غایت درجہ مجرّد اور منزہ حقیقت ہے جس کے تصور سے انسان کے ذہن کو روشن کرنے کے لیے لفظ ”نور“ سے زیادہ اقرب اور کوئی لفظ نہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہ رائے مان لی جائے کہ ”جن“ اسی مادی آگ کے بنے ہوئے ہیں جو عناصر ربو میں سے ایک ہے تو روحانی فرشتوں کے مقابلہ میں ان مادی جنوں کا مرئی محسوس بن جانا تو اور بھی زیادہ قریب از عقل و قیاس ہے۔

اور شیاطین کا اطلاق جنوں کی طرح انسانوں پر بھی کیا گیا ہے اس لئے آپ کہتے ہیں کہ ان مہماروں اور غوط خوروں کو ان کے مرئی ہونے اور انسانوں کے سے کام کرنے کی بنا پر شیاطین الانس کیوں نہ سمجھا جائے؟

اس کو دلیل کے بجائے میں صرف غلط فہمی کہوں گا۔ اول تو قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کے کاریگروں اور خادموں کے لیے حرفِ شیاطین ہی کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ جن کا لفظ بھی آیا ہے مثلاً

وَحِشْرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ (۲: ۲۷) -

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر از قسم جن و انس و پرند جمع کیے گئے۔

اور جنوں میں سے جو اس کے ذیعنی حضرت سلیمانؑ کے آگے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے.... جو کچھ وہ چاہتا وہ اس کے لیے بناتے تھے بڑی بڑی عمارتیں اور موتیں اور لگن کی طرح کے حوض اور ایک جگہ جمی رہنے والی بجار رگیں.... جب ہم نے سلیمانؑ پر موت کا فیصلہ کر دیا تو ان کو اس کی موت کی خبریں چیزنے کی وہ کچھ اور نہ ملتا محض زمین کا کیرا تھا جو سلیمانؑ کھاکو کھاتا تھا جیسا کہ گریپے تیلان جنوں پر از کھلا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اتنی مدت تک اس ذلت غلامی کے عذاب میں نہ رہتے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ... يَغْلَوْنَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ حَارِيبٍ وَمَثِيلٍ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَةٍ... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةٌ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۲: ۳۴) -

۵۶
۱۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں جن کے ساتھ انس کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ (بقدرِ نوٹ صفحہ) ملاحظہ ہو

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غوط خور اور معمارِ شیطینِ جن کی قسم سے تھے،
شیاطینِ الانس نہ تھے۔

دوسرے یہ بات آپ کی اور مولانا کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی کہ قرآن مجید میں کہیں مطلقاً
الشیطان اور الشیاطین بول کر انسان مراد نہیں لئے گئے ہیں بلکہ ابلیس اور اس کی ذریت
مراد لی گئی ہے۔ ہاں اگر کہیں انسانوں کے کسی گروہ کے لیے شیطین کا لفظ بطور صفت
استعمال کیا گیا ہے تو ایسے ہر موقع پر صراحتاً یا کنایتاً یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاں شیطین
سے مراد انسان ہیں جیسے جَعَلْنَا لَإِبْلِیْ عَدُوًّا الشَّیَاطِیْنَ الْإِنْسِ وَ الْجِنِّ (۶: ۱۲)
اور وَ اِذْ اَخْلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ (۲: ۱۲)۔

ایمان یا کتاب کا مقتضی | اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی ایسی قوی دلیل موجود
نہیں ہے جس کی بنا پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قصہ پر یا کسی دوسرے مقام پر لفظ "جن" کے
معنی متعین کرنے میں اس معنی سے انحراف کرنا جائز ہو جس کی تصریح خود قرآن مجید متعدد مواقع پر
کر چکا ہے۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو کسی شخص کے لیے جو قرآن مجید کے کلام الہی ہونے پر ایمان
رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ جس کو خدا نے جن کہا ہے اور آدمی نہیں کہا اس کو وہ اپنے قیاس سے

یہ جن وہ جن تھے جن کو غیب دانی کا گھمنڈ تھا۔ انہی جنوں میں سے ایک گروہ بعد میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم
سے قرآن سن کر اپنے دوسرے ہم قوموں سے کہتا ہے کہ اب ہمارے غیب دانی کے وسائل ہم سے
چھین گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ وَ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَهَا - مِلَّتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَ
شُهَبًا وَ اَنَّا کُنَّا نَقْعُدُ مَقَاعِدَ لِّلْمَسْمُوعِ فَمِنْ لَّمْ یَسْمَعْ اِلَّا نَّ یَجِدْلُهٗ سِهَابًا رَّصَدًا (۱۱: ۶)۔

اس آیت میں غیب کی خبریں حاصل کرنے کی جو صورت بیان کی گئی ہے، وہ انسان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کجا کہ
کوئی انسان اس پر قادر ہو۔

آدمی کہہ دے۔ ایسا قیاس کرنے کے لیے اگر کوئی سبب داعی ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عادت جاریہ میں کامشاہدہ اور ادراک کرنے کے ہم غور ہیں ان واقعات کے خلاف ہے جو بعض مواقع پر قرآن مجید میں جنوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن اسی طرح آگ کا ایک خاص شخص کے لیے سرد ہو جانا لکڑی کا ایک خاص موقع پر اژدہا بن جانا اور یا کا ایک خاص وقت میں بھٹ کر راستہ دے دینا ایک شخص کا مٹی کے پرند بنا کر ان میں جان ڈال دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا نچند آدمیوں کا ایک غار میں ۳۰۹ برس تک پڑے سوتے رہنا اور پھر بھی زندہ رہنا ایک شخص کا مرنے کے سو برس بعد جی اٹھنا اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو جوں کا توں بالکل تازہ حالت میں پانا ایک شخص کا ساڑھے نو سو برس تک زندہ رہنا اور وہ بھی یوگ کی مشقوں سے نہیں بلکہ ایک منکر قوم کے مقابلہ میں تبلیغ دین کی تحفہ دینے والی مشقوں کے ساتھ یہ اور ایسے ہی متعدد واقعات ہیں جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں اور بس اس عادت جاریہ کے خلاف ہیں جس کو دیکھنے کے ہم غور رہے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو خدا کے عظیم و خیر اور قادر و توانا کا کلام نہ مانیں تو سرے سے ان واقعات کی تاویل ہی کرنے کی ضرورت نہیں محض اس بنیاد پر ہی ان سب کو جھٹلایا جاسکتا ہے کہ ایسا ہوتے ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ دیکھا۔ اور اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جو ازل سے ابد تک عالم وجود کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا حقیقی علم رکھتا ہے اور خدا وہ خدا ہے جس کے معجزے ہم کو سورج اور سیاروں اور زمین اور خود اپنے وجود میں ہر آن نظر آ رہے ہیں تو ہمیں کسی غیر معمولی اور خلاف عادت واقعہ کو بعینہ اسی طرح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا جس طرح وہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات تو کیا چیز ہیں اگر قرآن میں کہا گیا ہو تا کہ ایک وقت میں چاند کو ماؤنٹ ایورسٹ پر لا کر رکھ دیا گیا تھا اور کسی وقت خدا نے سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالا تھا تب بھی ایک مومن صادق کو اس بیان کی صداقت میں ایک لمحہ کے لیے شک نہ ہو سکتا تھا اور نہ کسی طرح تاویل کر کے اس کو عادت جاریہ کے مطابق

ثابت کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ کائنات جس کی وسعت کا تصور کرنے سے ہمارا دماغ خفاک جاتا ہے اور اس کائنات کی ہر شے حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا اور کرسی جانور کے جسم کا ایک بال بھی اپنی پیدائش میں حقیقت اتنا ہی حیرت انگیز اور اعجاز نما ہے جتنا چاند کا ایورسٹ پر آجانا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ ایک قسم کے واقعات کو دیکھنے کی ہیں عادت ہو گئی ہے اس لیے ہم کو ان کے معجزہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا اور دوسری قسم کے واقعات شاذ ہیں اس لیے ان کی خبر جب ہم کو دی جاتی ہے تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے اور ہماری عقل جو صرف مشاہدات و تجربات پر اعتماد کرنے کی خوگر ہو گئی ہے ان کو باور کرنے میں جھجکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق جب ہم کو کوئی خبر دی جائے تو ہمیں حق ہے کہ ان کے وقوع کے متعلق قابل وثوق شہادت طلب کریں لیکن ایک مومن کے لیے قرآن سے بڑھ کر قابل وثوق شہادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے اور خدا کے فعل پر خود خدا ہی کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ البتہ جو شخص قرآن کے کلام الہی ہونے میں شک رکھتا ہو اس کو حق ہے کہ قرآن کے ہر بیان میں شک کرے خواہ وہ عادت جاریہ کے موافق ہو یا مخالف۔

(باقی)